OPEN ACCESS
MA'ARIF-E-ISLAMI (AIOU)
ISSN (Print): 1992-8556
ISSN (Online): 2664-0171
https://mei.aiou.edu.pk

تذکیر القرآن از مولانا وحید الدین خان میں مباحث دعوت: تجزیاتی مطالعہ

Analytical study of Dawah thoughts in Tazkir-ul-Quran

محمد ظفر اقبال

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، میانوالی

ڈاکٹر محمد سجاد

چیئرمین، شعبہ مطالعات بین المذاہب، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

Abstract

Molana Waheed -ud-din Khan (1925) is a renowned Islamic scholar, preacher, Quranic commentator and thinker. He explained Islamic teachings according to contemporary needs and style. His writing and preaching style or method is very simple, effective and sweet. He focused on preaching and rectification in his scholarly work. He supposed that the massage of Islam is actually the massage of rectification and call of Islam. The Holy Quran is a book of Dawah and the mission of holy prophet is the mission of Dawah. Molana highlighted this thoughts in his research work. He named his Quranic commentary by Tazkir-ul-Quran, due to the fact that Quran is the book for call to Islam. Quranic teachings are natural. The historical events described in Quran are depends on well being of Humanity. Similarly, Quran describes the humanity and universe which has clear signs of right path for intellectalus. In Tazkir-ul-Quran, Molana has described the basic massage of Quran, which is welfare, rectification and call to Islam. The methodology, he adopted in commentary of a particular verse is the description of that verse about Quran and advise. In this article, dawah thoughts in Tazkir-ul-Quran are discussed. Basically, in this article. Sole selected verses from Tazkir-ul-Quran has been discussed to pin pont the Dawah thoughts of Molana Waheed.

مولانا وحید الدین خان کے احوال

مولانا وحید الدین خان یکم جنوری ۱۹۲۵ء میں اعظم گڑھ (یوپی) کے ایک دور افتادہ گاؤں میں پیدا ہوئے۔ جب ان کی عمر چار سال تھی تو والد انتقال کر گئے، ان کی پیدائش چونکہ ایک گاؤں میں ہوئی تھی اس لئے شخصیت اور نظریہ میں بھی وہی فطری رنگ نظر آتا ہے جو ایک گاؤں کی زندگی میں ہوتا ہے جس کا اظہار وہ خود ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"میری ابتدائی زندگی اس دور افتادہ گاؤں میں گزری، یہاں تمدن جیسی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ میرے گاؤں کے پاس ایک ندی بہتی تھی جو گویا یہ خاموش پیغام دے رہی تھی کہ زندگی ایک مسلسل حرکت کا نام ہے نہ کہ

جمود کا۔ دن کے وقت سورج کی حیات بخش روشنی اور رات کو ستاروں کی مسحور کن جگمگاہٹ، کائنات کی معنویت کا تعارف کراتی تھی، گاؤں کے چاروں طرف دور تک پھیلے ہوئے باغ اور کھیت کی ہریالی بتاتی تھی کہ زندگی ایک نموپذیر حقیقت کا نام ہے۔ تازہ ہوا کے جھونکے اور چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں، سمع وبصر اور فواد، کے لیے مسلسل طور پر روحانی غذا کا ذریعہ بنی تھی۔ یہ گویا فطرت کی تعلیم تھی، اس تعلیم گاہ کے اندر میری شخصیت بنی، میرا ذوق ہر اعتبار سے فطری ذوق بن گیا۔ میری سوچ اپنے آپ وہ سوچ بن گئی جس کو آفاقیت اور حقیقت پسندی کہا جاتا ہے۔ ابتدائی دور میں میرا یہ، صحرائی تجربہ، ہر قسم کے منفی تصورات سے خالی تھی، غالباً یہی وجہ ہے کہ راقم الحروف کی چلائی "الرسالہ تحریک" دورِ جدید کی وہ اسلامی تحریک تھی جو کسی رد عمل کے تحت شروع نہیں ہوئی بلکہ وہ مکمل طور پر مثبت ذہن کے تحت شروع ہوئی۔"[1]

ابتدائی تعلیم

ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں کے ایک مدرسہ میں حاصل کی۔ مولانا نے انگریزی کی بجائے اپنی ابتدائی تعلیم مدرسے میں قرآن مجید اور اردو کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی زبان بھی سیکھی۔ مولانا چونکہ بچپن سے ہی باپ کے سائے سے محروم ہو گئے تھے۔ اس لئے ان کی کفالت ان کے چچا صوفی عبد المجید خان (وفات ۱۹۴۷ء) نے کی۔ انہی کے اصرار پر ۱۹۳۸ء میں انہیں عربی کی مشہور درس گاہ مدرسہ الاصلاح (سرائے میر) میں داخل کرادیا گیا۔ مولانا نے یہاں مدرسہ کی تعلیم مکمل کی۔ دورانِ تعلیم مولانا امین احسن اصلاحی کے درس سے متاثر ہوئے۔ مولانا وحید الدین خان کی زندگی کے رخ کو جس واقعے نے متعین کیا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے، زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیے وہ یہ ہے۔

"غالباً ۱۹۴۰ء کا واقعہ ہے، مولانا امین احسن اصلاحی (وفات ۱۹۹۸ء) اس وقت مدرستہ الاصلاح کے صدر مدرس تھے۔ ایک دن کلاس میں قرآن کی یہ آیت زیر بحث آئی۔ ﴿اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَت﴾[2] آیت کی تفسیر کرتے ہوئے انہوں نے طلبا سے ایک سوال کیا۔ انہوں نے پوچھا کہ اونٹ کے سم پھٹے ہوئے ہوتے ہیں یا جڑے ہوئے کلاس میں اس وقت بیس سے زیادہ طالب علم تھے مگر کوئی بھی یقین کے ساتھ اس سوال کا جواب نہ دے سکا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک تقریر کی انہوں نے عربی مقولہ لاادری نصف العلم (میں نہیں جانتا، کہنا، آدھا علم ہے) کا فلسفہ بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ اپنے نہ جاننے کو جاننا، تعلیمی سفر کی پہلی منزل ہے۔ آدمی اگر اپنی لاعلمی سے بے خبر ہو تو اس کے اندر جاننے کا شوق پیدا نہیں ہوگا، وہ بدستور بے خبر پڑا رہے گا۔ انہوں نے طلبا سے کہا کہ آپ لوگ اونٹ کے سم کے بارے میں اپنے، لاادری، سے بے خبر تھے، اگر آپ کو اس معاملے میں اپنے۔ (لاادری) کو جانتے تو اونٹ دیکھ کر آپ اس کو معلوم کر لیتے۔ لیکن اپنے۔ (لاادری) کو نہ جاننے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بار بار اونٹ دیکھنے کے باوجود آپ اونٹ کے سم کے بارے میں بے خبر رہے۔ میری ابتدائی زندگی کا یہ واقعہ گویا میرے تفکیری سفر کے لیے ایک رجحان ساز (trend setter) واقعہ بن گیا۔ یوں مولانا صاحب

نے اپنی تعلیم مدرستہ الاصلاح سے مکمل کی اور مدرستہ الاصلاح کا ایک خاص پس منظر اور خاص فکر ہے۔ جو مولانا صاحب پر بالواسطہ اور بلاواسطہ اثر انداز ہوا۔"[3]

مولانا وحید الدین خان کی دعوتی فکر و خدمات

۱۹۵۰ء میں پچیس سال کی عمر میں۔ من انصاری الی اللہ۔ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، پھر اسی مقصد کے لیے ادارہ اشاعت اسلام کے نام سے اپنے دعوتی سفر کو جاری رکھا۔ مولانا صاحب سب سے پہلے جس تحریک سے متاثر ہوئے وہ جماعت اسلامی تھی۔ یہاں مولانا کی زندگی کا ایک الگ ہی رنگ تھا۔ بالکل سادہ منش آدمی کے طور پر اپنی اس زندگی کا آغاز کیا۔ اسلام کی تبلیغ واشاعت کا جذبہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے جماعت اسلامی کے ایام کا تذکرہ پروفیسر عدنان ہاشمی نے کچھ یوں کیا ہے۔[4]

"یہ وہ دور ہے جب مولانا وحید الدین خان صاحب جماعت اسلامی ہند کے ایک ذمہ دار کی حیثیت سے شعبہ نشر اشاعت کے انچارج ہیں۔ سادگی کے پیکر، صوفی منش، اقامت دین کی عظیم ذمہ داریوں کا احساس اس قدر غالب ہے کہ تن بدن کا ہوش نہیں۔ پیروں لکڑی کے تلے اور بڑی پٹی والی قدیم طرز کی کھٹپٹی، لباس معمولی، بال بکھرے ہوئے، ہر وقت ایک ہی دھن کہ دین حق کو بھولا ہوا، اس سے دور، اس کے عظیم برکتوں اور نعمتوں سے محروم آج کا انسانی معاشرہ، راہ حق کے مختصر سے قافلہ کی محنت، لگن ایثار وقربانی سے اگر راہ مستقیم پر آجائے اور اللہ کا دین مغلوبی ومحکومی کی پستی سے نکل کر فرد، معاشرہ اور نظام کے اندر جاری وساری، اس پر نافذ اور غالب ہوجائے تو یہ اس قافلے کی بھی خوش بختی وسعادت قرار پائے اور ملک ووطن کے انسان بھی اس دین کے فیوض وبرکات سے بہرہ ور ہوں۔ یہ تھا اقامت دین کا اعلیٰ وارفع تصور جو جماعت کے تمام متوسلین، ارکان، کارکنان اور ذمہ داران کی طرح خان صاحب کو بھی بے چین کئے رکھتا تھا۔ لیکن یہ امتیازی کیفیت صرف خان صاحب کی ہی تھی جو اپنے نصب العین کے حصول کی فکر میں اس طرح جذب ہو کر رہ گئے تھے کہ بقول ڈاکٹر عبدالباری شبنم سبحانی "خان صاحب کی اس مجذوبیت اور دھن کی کیفیت دیکھ کر آدمی ان کا عقیدت مند ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ مرکزی دفتر کا کوئی کارکن شیروانی پہن کر، سارے بٹن سلیقے سے بند کرکے آتا تو محبت بھری ڈانٹ پڑتی کہ اس طرح نستعلیق، ہو کر آپ اقامت دین کا فریضہ انجام دیں گے؟ کسی کے پیروں میں اچھے یا نئے جوتوں کا جوڑا دیکھتے تو ناراض ہوتے کہ اس رکھ رکھاؤ کے ساتھ آپ اقامت دین کی جدوجہد کیا خاک کریں گے۔ کسی کارکن نے برسات میں چھتری خرید لی تو ناراض ہو کر نصیحت کی کہ دیکھو میاں! ضروریات ربڑ کی طرح ہوتی ہیں انہیں جتنا ہی کھینچو گے، بڑھتی جائیں گی۔ لہذا انہیں کھینچ کھینچ کر بڑھاؤ مت، بڑھتی ہوئی ضروریات کا اسیر شخص اقامت دین جیسا پِتہ ماری کا کام نہیں کر سکتا۔ سادگی، قناعت، توکل علی اللہ اور حصول مقصد کے لیے ایثار وقربانی کی انتہا تھی۔"[5]

جماعت اسلامی سے علیحدگی

سید ابوالاعلیٰ مودودی کی سیاسی فکر سے اختلاف کی بناء پر مولانا وحید الدین خان جماعت اسلامی سے الگ ہو گئے، کچھ عرصہ تبلیغی جماعت سے وابستہ رہے، یہاں بھی جماعت کی دینی فکر پسند نہ آئی، ندوۃ العلماء اور جمعیت علماء ہند سے بھی وابستہ رہے، ان تمام تنظیموں سے وابستگی اور پھر علیحدگی کے بعد مولانا اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ جماعتیں اپنے فکر و عمل میں ایک خاص سوچ رکھتی ہیں جس میں گروہی اور فرقہ کی عصبیت شامل ہے۔ مولانا بیان کرتے ہیں:

"میرے ذہن میں اول روز سے یہ تھا کہ مجھے اپنی کوئی علیحدہ جماعت بنانا نہیں ہے بلکہ موجودہ جماعتوں اور اداروں سے مل کر کام کرنا ہے۔ اس سلسلے میں اکثر بڑی جماعتوں اور اداروں کے ساتھ تنظیمی طور پر وابستہ ہوا۔ مگر تجربے کے بعد معلوم ہوا کہ ہر جماعت اور ہر ادارہ، گروہی عصبیت کا شکار ہے۔ میرے جیسا آدمی کسی بھی ادارے یا جماعت کے ساتھ زیادہ فعال انداز میں کام نہیں کر سکتا۔ مثلاً میں اس معاملے میں جماعت اسلامی ہند سے وابستہ ہوا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ جماعت اسلامی کی فکر کا سرچشمہ حقیقتاً قرآن وسنت نہیں ہے بلکہ وہ قرآن وسنت کی ایک منحرف سیاسی تعبیر ہے۔ چنانچہ میں زیادہ دیر تک جماعت اسلامی کے ساتھ نہ چل سکا۔ اسی طرح کچھ عرصے کے لیے میری وابستگی تبلیغی جماعت سے ہوئی، مگر اس سے قریب ہو کر معلوم ہوا کہ تبلیغی جماعت بھی اصلاً قرآن وسنت پر نہیں کھڑی ہوئی ہے۔ بلکہ وہ اپنی، جماعتی انجیل، پر کھڑی ہوئی ہے، جس کا نام، فضائل اعمال، ہے۔ اسی طرح میں چند سال کے لیے ندوۃ العلماء (لکھنو) سے وابستہ رہا، مگر میں نے پایا کہ یہاں کے ماحول میں خدا پرستی سے زیادہ شخصیت پرستی کا غلبہ ہے۔ یہ بلاشبہ ایک مبتدعانہ مزاج تھا۔ میں اس مزاج کے ساتھ مصالحت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے اس سے بھی میرا تعلق ٹوٹ گیا۔ یہی معاملہ جمعیت علماء ہند کے ساتھ پیش آیا۔ اس کے ساتھ میں چند سال تک وابستہ رہا مگر آخرکار معلوم ہوا کہ جمعیت علماء ہند کا سارا زور ملی سیاست پر ہے اور ملی سیاست میرے دعوتی مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی۔ ان تجربات کے بعد آخرکار میں نے ۱۹۷۶ء میں ماہانہ ،الرسالہ، جاری کیا۔ الرسالہ اپنی ابتدا ہی سے صرف ایک ماہنامہ نہیں تھا بلکہ مشن تھا۔ الرسالہ کا مقصد اسلام کو مسلمانوں کی قومی سیاست سے الگ ہو کر خالص دعوتی حیثیت سے زندہ کرنا تھا۔ خدا کی توفیق سے الرسالہ اسی نہج پر قائم ہے۔ کوئی بھی شخص الرسالہ کے شماروں کا مطالعہ کر کے اس حقیقت کو سمجھ سکتا ہے"۔[6]

علمی زندگی

مولانا وحید الدین خان کی علمی زندگی، عملی یا دعوتی زندگی سے مختلف نہیں ہے کیونکہ جوان کی دعوتی زندگی ہے وہی ان کی علمی زندگی ہے۔ مولانا صاحب کی علمی زندگی دو ادوار میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔

۱۔ ۱۹۷۶ء سے پہلے کا زمانہ ۲۔ ۱۹۷۶ء سے بعد کا زمانہ

۱۹۷۶ء سے پہلے کا زمانہ

عربی زبان تو مولانا نے بچپن ہی سے پڑھنا شروع کر دی تھی اور بعد میں مدرستہ الاصلاح میں پڑھنے کی وجہ سے ان کے اندر جو مذہبی رجحان تھا اس کو اور تقویت ملی، ان کے پہلے مضمون، قرآن کا مطلوب انسان، جماعت اسلامی کے سہ روزہ اخبار، دعوت، کے شمارہ میں ۱۹۵۵ء میں چھپا۔ ۱۹۵۵ء کے بعد سے ان کے مضامین بہت سے اردو اخباروں اور رسالوں میں چھپنے شروع ہوئے۔ ان میں زیادہ مشہور نگار، شاعر، پیام تعلیم، عصمت، ندائے ملت، الفرقان، دعوت اور زندگی وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ سہ روزہ کے لیے الجمعیۃ میں ایڈیٹر کی حیثیت سے ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۴ء تک کام بھی کرتے رہے۔

اس دور میں مولانا صاحب کے لیے کوئی خاص راہ متعین نہ تھی جہاں کہیں بھی دین کا کوئی کام ہوتا دیکھتے اس کا ساتھ دینے کی کوشش کرتے۔ اسی سلسلے میں مولانا نے مختلف مذہبی و سیاسی جماعتوں کے ساتھ ملکر کام کیا اور اسی دور میں ہی مولانا نے انگزیری زبان سیکھی اور مغربی مفکرین کا مطالعہ کیا۔ ۱۹۶۳ء میں مولانا نے دوبارہ نئے سرے سے دین کا مطالعہ از سر نو کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسلام کی اساسات کو جاننے کے لیے اس کے اصل مصادر و مراجع کی طرف رخ کیا۔ ان دنوں مولانا صاحب کے تین ہی شوق تھے پہلا انگریزی سیکھنا، دوسرا مغربی مفکرین کے نظریات کا مطالعہ کرنا اور تیسرا اور آخری دین کو نئے سرے سے اس کے اصل ماخذ کے ساتھ پڑھنے میں مشغول رہنا، ان تینوں میں مولانا میں جنون کی کیفیت پائی جاتی تھی جس کا ذکر مختلف جگہوں پر وہ خود کرتے ہیں مثلاً انگریزی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "میں اعظم گڑھ میں اپنے بڑے بھائی عبد العزیز خان کے ساتھ مقیم تھا۔ عجیب بات ہے کہ کوئی بھی شخص مجھے حوصلہ افزائی کرنے والا نہیں ملا۔ میرے بڑے بھائی نے جب یہ دیکھا کہ میں انگریزی زبان سیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں تو انہوں نے کہا۔ بڑھا طوطا کیا پڑھے گا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں باقی منزل (اعظم گڑھ) میں انگریزی اخبار ہندوستان ٹائمز کھول کر اسے دیکھ رہا تھا کہ مولانا شہباز اصلاحی وہاں آ گئے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ۔ کچھ سمجھ بھی ہے یا یوں ہی انگریزی اخبار لے کر بیٹھے ہوئے ہو، اس زمانے میں میرا یہ حال تھا کہ ہر وقت میں انگریزی کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ میری اس عادت پر میری ماں غصہ ہوتی تھیں اور کہتی تھیں کہ تم کسی نہ کسی دن سڑک پر کسی گاڑی سے ٹکرا جاؤ گے۔ [7] انگریزی کے بعد مغربی مفکرین کو پڑھنے کا شوق چڑھا تو گھنٹوں مہتاب لائبریری میں بیٹھ کر جدید دور کے مغربی سکالرز کی کتابیں پڑھنے بیٹھ گئے۔ یہاں مختلف سکالرز کی کتابیں روزانہ گھنٹوں بیٹھ کر پڑھتے۔ مغربی سکالرز کو پڑھنے کے بعد عام آدمی لازمی طور پر ان سے متاثر ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کی فلسفیانہ باتیں عام آدمی کے مسائل کا سطحی حل بتاتی ہیں اور جہاں انسان کو اس کے مسائل کا حل ملے پھر اسی کے گیت گاتا ہے اور دین چونکہ انسان کی آزمائش چاہتا ہے اور آزمائش ہمیشہ مشکل ہی ہوتی ہے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آدمی دین سے دور ہوتا جاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ خود کو کلی طور پر مار دیتا ہے یا جزوی طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آرام کرنے کے لیے بھیج دیتا ہے۔ مگر مولانا کے ساتھ معاملہ

اس کے برعکس ہوا۔ وہ جوں جوں ان کا مطالعہ کرتے گئے توں توں ان کا ایمان اللہ پر مضبوط ہوتا گیا۔ وسعت مطالعہ نے ان کے ذہن کے سوتے کھول دیئے تاکہ دین ذہن کی آبیاری کر سکے۔ مغربی سکالرز کے رد عمل کو مولانا یوں بیان کرتے ہیں: یہ ۱۹۲۲ء کی بات ہے میں نے طے کیا کہ میں برٹرینڈ رسل (۱۸۷۲ء-۱۹۷۰ء) کو پڑھ ڈالوں۔ خوش قسمتی سے میرے قریب شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ کی لائبریری میں مجھے رسل کی کتابوں کا پورا اسیٹ مل گیا۔ مگر جب میں ان کتابوں کو لے کر گھر پہنچا تو میری بیوی ان کو دیکھ کر بہت متوحش ہوئیں۔ اب آپ ضرور گمراہ ہو جائیں گے، انہوں نے کہا۔ رسل اس دور میں معروف ترین ملحد ہے۔ اس لحاظ سے اس کی تصنیفات کو پڑھنا عام دینی ذوق کے مطابق خطرے سے خالی نہ تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ میں رسل کی دنیا میں داخل ہو کر اس طرح سے نکلا کہ میرا ایمان پہلے سے زیادہ پختہ ہو چکا تھا۔"[8]

جدت کا فائدہ

جدیدیت کا نقصان ہونے کی بجائے الٹا مولانا صاحب کو فائدہ ہوا۔ کیونکہ اب وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ اسلامی تعلیمات کو عصری اسلوب میں پیش کر سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے اندر یہ احساس بھی شدت سے جاگا کہ انہیں دوبارہ دین کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ پھر مولانا نے بڑے زور وشور کے ساتھ اسلام کا مطالعہ از سر نو شروع کیا اور اس شدت سے شروع کیا کہ وہ دنیا ومافیہا سے بے نیاز ہو گئے۔

مولانا مختلف اخبارات و جرائد میں لکھتے رہے۔ ان میں سے بیشتر مضامین اسلام اور عصر حاضر کے عنوان کے متعلق ہوتے تھے۔ اس کے بعد اس موضوع پر ان کی پہلی مفصل کتاب، علم جدید کا چیلنج، ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی اور اسلام کے مفصل مطالعے کے بعد جو کتاب ان کی طرف سے منظر عام پر آئی وہ ۱۹۷۵ء میں چھپنے والی کتاب، اسلام، تھی۔

۲۔ ۱۹۷۶ء کے بعد کا زمانہ

الرسالہ کا اجراء

اکتوبر ۱۹۷۶ء میں، الرسالہ، کا پہلا پرچہ جاری ہوا۔ یہاں سے مولانا کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا، ایک نئی زندگی کی ابتدا ہوئی۔ ان کی زندگی جس مقصد کے حصول کے لیے بھٹک رہی تھی اس کو بالآخر الرسالہ کے ساتھ ہی وہ مقصد مل گیا۔ اس رسالے کا نام ڈاکٹر ظفر الاسلام خان مولانا کے فرزند (پیدائش ۱۹۴۸ء) نے تجویز کیا۔ شروع میں یہ رسالہ محض ایک ماہنامہ تھا مگر بہت جلد ہی ایک مشن کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس کے ذریعے مولانا نے مغربی دنیا تک اسلام کو جدید انداز میں پھیلانا شروع کیا اور یہ کام آج تک جاری و ساری ہے۔ مولانا کا ایک خاص فلسفہ ہے اس میں اہم چیز خدا کا تصور ہے اور انذار آخرت کی دعوت ہے۔ باقی نبوت اور اجتماعیت ایک ثانوی حیثیت سے ان دونوں مقاصد کے حصول کے لیے کام کرتی ہیں اور یہی خاص رنگ ان کی تحریروں میں جھلکتا ہے یہ بات ان کی تفسیر میں بھی نظر آتی ہے چونکہ ان کی فکر میں اجتماعیت کا تصور نہیں صرف انفرادیت ہی انفرادیت

ہے اس لئے ان کی بات مغربی ممالک کو نا گوار نہیں گزرتی اور وہ ان کی بات سن لیتے ہیں۔ اپنے اس نظریے کو مولانا خود اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں۔

"میں اپنے تفصیلی مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کی تعلیمات مکمل طور پر خدا اور آخرت کے مرکزی تصور پر مبنی ہیں۔ اسلام میں دعوت دراصل انذار آخرت کی دعوت ہے۔ انسان کے اندر متقیانہ ذہن بنانا اور اس کے اندر ربانی شخصیت کی تعمیر کرنا، یہی اسلام کی دعوت کا اصل نشانہ ہے۔ یہی میرا ذہن آج بھی ہے۔"[9]

اس ،الرسالہ، ہی کی بدولت مغربی دنیا کے اندر مولانا کی فکر پہنچی، پھر ان کے نقطہ نظر کو جاننے کے لیے مختلف ممالک سے دعوت نامے آنے شروع ہو گئے۔ مختلف کانفرنسوں میں انہیں بلایا جانے لگا۔ بلایا تو پہلے بھی جاتا تھا مگر صرف ملکی سطح پر ہونے والی کانفرنسوں میں مگر اس اشاعت کے بعد پوری دنیا میں ان کو پذیرائی ملی۔ ۱۹۷۶ء سے اس سلسلے میں مولانا کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ اس سال مسلم، کرسچن ڈائیلاگ میں شرکت کی جو لیبیا کی دارالحکومت طرابلس میں ہوا تھا۔ اس میں مسلمانوں کی طرف سے جامعۃ الازہر (قاہرہ) کے نمائندہ نے شرکت کی اور ویٹکن (روم) نے مسیحیت کی طرف سے نمائندگی کی۔ ان کی دعوت پر مولانا نے اس میں شرکت کی۔

مولانا خود لکھتے ہیں: اس کے بعد عالمی سفروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ملک کے اندر اور ملک کے باہر مسلسل طور پر مختلف مذاہب کی عالمی کانفرنسیں ہوتی رہتی ہیں۔ مجھے ان کانفرنسوں میں ہر جگہ بلایا جانے لگا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ میرے بارے میں یہ مشہور ہو گیا کہ وہ مسلم علما میں معتدل اور سائنٹفک ذہن کے آدمی ہیں اور اسلام کی پر امن تشریح پیش کرتے ہیں۔ اس طرح مجھے یہ موقع مل گیا کہ میں ہر جگہ جا کر عالمی اجتماعات میں اسلام کی تعلیمات کو مثبت انداز میں پیش کروں۔ یہ اسفار جو تادم تحریر جاری ہیں ان کا مختصر تذکرہ میرے ان سفروں میں دیکھا جا سکتا ہے جو برابر الرسالہ میں چھپتے رہتے ہیں۔ ان سفروں کے تجربات بہت سبق آموز ہیں مثلاً میں نے غیر مسلموں کے ایک اجتماع میں اسلام کا تعارف پیش کیا۔ اس میں میں نے کہا کہ اسلام اپنے ماننے والوں کے اندر انسانی خیر خواہی کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ وہ اہل ایمان کو انسان دوست بناتا ہے۔ آخر میں ایک غیر مسلم نے کھڑے ہو کر کہا آج میں نے اسلام کا سچا تعارف حاصل کیا۔ اب میں نے یہ طے کیا کہ آج سے میں نہ صرف انسان فرینڈلی بنوں گا بلکہ اس کے ساتھ میں اسلام فرینڈلی بھی بنوں گا"۔[10]

مولانا کی علمی اور دعوتی خدمات اسلام کے لیے بے شمار ہیں ان سے کوئی ذی شعور انسان انکار نہیں کر سکتا۔ ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ انہوں نے سیاسی مقاصد سے ہٹ کر خالص دینی بنیادوں پر کام کیا ہے۔

۲۔ الرسالہ ایک ایسا مشن ہے جو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

۳۔ سینٹر فار پیس اینڈ اسپر یچولٹی جو کہ ہفتہ وار کلاس ہے، انگریزی طبقے سے متاثر نوجوانوں کو اسلام کی تبلیغ کے لیے ایک مرکز ہے۔ قابل ستائش عمل ہے۔

تصانیف

اب تک مولانا صاحب کی دو سو سے زیادہ کتب چھپ چکی ہیں۔ جن کے انگریزی، عربی اور کئی علاقائی زبانوں میں تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ ان میں چند ایک کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کیا گیا ہے:

۱۔تذکیر القرآن

یہ قرآن پاک کی دعوتی انداز میں لکھی گئی تفسیر ہے۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی زبان نہایت آسان اور شیریں ہے اور پڑھنے والے کو مکمل ابلاغ دیتی ہے۔ تمام نحوی، صرفی، فقہی، ادبی اور صوفی انداز سے ہٹ کر لکھی گئی اپنی نوعیت کی واحد تفسیر ہے۔ اسکا مطالعہ ایسے شخص کے لیے موزوں ہے جو آخرت کے حوالے سے خدا کا تصور جاننا چاہتا ہو۔

۲۔ماہنامہ الرسالہ

الرسالہ کے نام سے ۱۹۷۶ء سے تاحال ایک ماہ وار شمارہ جاری ہے۔ یہ چالیس پچاس صفحات کا ایک شمارہ ہوتا ہے جس میں صرف مولانا صاحب کی تحریریں ہوتی ہیں۔ اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ چھپتا ہے۔ اس میں زیادہ تر موضوع قرآن کی کسی آیت کی تشریح، مولانا کے اسفار اور ان کے تجربات پر مشتمل ہوتے ہیں اور عام طور پر مضمون چند صفحات سے زیادہ کا نہیں ہوتا جس کی وجہ سے عام قاری بھی اپنی دلچسپی کھوئے بغیر جہاں سے جی چاہے وہاں سے پڑھنا شروع کر سکتا ہے۔

۳۔علم جدید کا چیلنج

یہ اسلام اور عصر حاضر کے موضوع پر مولانا کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ اس میں سائنسی ایجادات کے قرآن و عقل کے ذریعے جوابات دیئے گئے ہیں۔ یہ شاید اس موضوع پر اپنی طرز کی پہلی اردو کتاب ہے کیونکہ یہ 1966ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس کے بعد انہی سوالات کو لے کر اور لوگوں نے بھی اس موضوع پر کتب لکھی ہیں۔ اس کا مطالعہ ایک ایسے شخص کے لیے بہت ضروری ہے جو ہر چیز کو سائنسی انداز میں پرکھنے کا قائل ہو۔

۴۔الاسلام

دین کی تعبیر و تشریح کے اعتبار سے مولانا کی سب سے پہلی مفصل کتاب ہے جو ۱۹۷۵ء میں مکمل ہو کر شائع ہوئی۔ اس میں مولانا صاحب دین کو جس نظر سے دیکھتے اور سمجھتے ہیں اس کی مکمل وضاحت موجود ہے۔ جیسے ہر بڑے عالم کے نزدیک اسلام کا ایک تصور ہے اور وہ اسی تصور میں پورے اسلام کو دیکھتا ہے بالکل اسی طرح، الاسلام، مولانا کے تصورات دین کی عکاسی ہے۔ جو حضرات مولانا صاحب کے تصورات دین پڑھنا چاہتے ہیں یا ان کے بارے میں تنقید کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے اس کتاب کا مطالعہ مفید رہے گا۔

۵۔ مذہب اور سائنس

مذہب اور سائنس کے موازنے کے بارے میں یہ بہت اچھی کتاب ہے۔ اس کتاب میں مولانا صاحب کے تمام سائنسی تصورات کا قرآن مجید سے موازنہ کر کے بتایا گیا ہے کہ سائنس مذہب سے الگ کوئی چیز نہیں۔ بلکہ سائنس تو قرآن حکیم کی عملی تصویر ہے۔ وہ تصورات جو قرآن نے آج سے چودہ سو سال پہلے دیئے تھے ان کی تصدیق سائنس نے آج کی ہے۔

۶۔ تعبیر کی غلطی

اس کتاب میں مولانا نے دین کی تعبیر کے حوالے سے ان غلطیوں کی نشاندہی کی ہے جو ان کی نظر میں دوسرے علماء (خصوصاً سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳-۱۹۷۹) سے ہوئیں۔ مولانا صاحب کی فکر کے مطابق ان علماء نے بات کو صحیح نہیں سمجھا اور ان کو چاہیے کہ وہ ان اعتراضات کی روشنی میں اپنے نظریات کا از سر نو جائزہ لیں جیسا کہ مولانا نے خود کیا ہے۔ انہوں نے اپنی پہلے کی زندگی اور بعد کی زندگی کا موازنہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ کہ انسان غلطیاں کرتا رہتا ہے اگر وہ اپنی اصلاح کر لے تو وہ غلطی، غلطی نہیں رہتی بلکہ خوبی بن جاتی ہے لیکن اگر غلطی واضح ہو جانے کے بعد بھی کوئی اپنی غلطی پر قائم رہے تو یہ اس کا بڑا پن نہیں بلکہ علم کی کمی ہے۔

۷۔ پیغمبر انقلاب

یہ سیرت النبی ﷺ پر لکھی جانے والی کتاب ہے۔ اس کو ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ اس میں زیادہ تر انہوں نے نبی کریم ﷺ کی مکی زندگی کو بیان کیا ہے اور مسلمانوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ بھی نبی ﷺ کی مکی زندگی کو اپنا شعار بنائیں کیونکہ وہ ابھی تک مکی زندگی کا دور جی رہے ہیں۔ اس میں مسلمانوں کو یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو مدنی دور کا باسی تصور کرتے ہیں حالانکہ بات اس کے برعکس ہے۔ انہیں نبی ﷺ کے اسوہ پر عمل کرتے ہوئے صلح حدیبیہ کو مد نظر رکھنا چاہیے۔

۸۔ ڈائری (۱۹۸۳ء تا ۱۹۹۲ء)

یہ مولانا صاحب کی مختلف سیمینار اور مختلف ممالک کے اسفار پر مشتمل کتاب ہے۔ یہ قسط وار ہر سال چھپ رہی ہے۔ اس میں بیرون ملک پیش آنے والی کانفرنسوں کے حالات اور لوگوں کے رویوں کا ذکر ملتا ہے۔ اصل میں یہ مولانا صاحب کی ذاتی ڈائری ہے جو ایک کتاب کی شکل میں ہر سال چھپتی ہے۔

۹۔ رازِ حیات

اس کتاب میں مختلف حلقہ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی ترقی کے اسباب، قصوں کی شکل میں تحریر کئے گئے ہیں اور اس کے بعد ان کی مثال کو سامنے رکھ کر قاری کو تلقین کی جاتی ہے کہ اگر وہ کامیاب زندگی گزارنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ ان واقعات سے سبق حاصل کرے اور بندہ مومن وہی ہوتا ہے جو دوسروں کو بھی جینے دے اور خود بھی امن سے جئے۔ یہ زندگی سے مایوس یا ایسے افراد جن کے سامنے زندگی کا کوئی رخ متعین نہیں ان کے لیے ایک بہترین کتاب ہے۔

۱۰۔ مطالعہ حدیث

یہ کتاب حدیث رسول ﷺ کے متعلق مولانا کا جو نقطہ نظر ہے اس کی جامع عکاسی کرتی ہے۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ حدیث دین کے سمجھنے اور زندگی کے شرعی مسائل کے حل کے لیے کس طرح معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

۱۱۔ سفر نامے

آپ کے سفر نامے کافی مشہور ہیں، جیسے سفر نامہ غیر ملکی اسفار جلد اول، دوم، سفر نامہ اسپین و فلسطین، اسفار ہند وغیرہ

مولانا وحید الدین خان کے نزدیک تفسیر کا مقصد اور تقاضے

مولانا وحید الدین خان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قرآن اگرچہ ایک اعلیٰ ترین علمی کتاب ہے، اس میں فطری حدود کے اندر علم و عقل کی پوری رعایت رکھی گئی ہے مگر قرآن مجید میں کسی بات کو ثابت کرنے کے لیے معروف علمی اور فنی انداز اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ قرآن مجید کا طریقہ یہ ہے کہ فنی آداب اور علمی تفصیلات کو چھوڑ کر اصل بات کو موثر دعوتی اسلوب میں بیان کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا مقصد علمی مطالعہ پیش کرنا نہیں، اس کا مقصد تذکیر و نصیحت ہے اور تذکیر و نصیحت کے لیے ہمیشہ سادہ اسلوب کارآمد ہوتا ہے نہ کہ فنی اسلوب۔

تاہم یہ ایک طالب علم کی ضرورت ہے کہ قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک آدمی قرآن مجید کے بیانات کی علمی تفصیلات اور اس کے فنی پہلوؤں کو جاننا چاہے۔ ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ قرآن کی تفسیر کے لیے کیا انداز اختیار کیا جائے۔ قرآن مجید کی تفسیر اگر اس کے اپنے سادہ دعوتی اسلوب میں کی جائے تو اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ تفسیر میں نصیحت اور تذکیر کی فضا باقی رہے گی جو قرآن مجید کا اصل مقصود ہے مگر ایسی صورت میں خالص علمی تقاضوں کی رعایت نہ ہو سکے گی اور دوسری طرف اگر علمی و فنی پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مفصل تفسیر لکھی جائے تو بعض خاص طبیعتوں کو وہ پسند آسکتی ہے مگر عام لوگوں کے لیے وہ ایک خشک دستاویز بن کر رہ جائیگی۔ مزید یہ کہ قرآن مجید کے اصل مقصد، تذکیر و نصیحت کو مجروح کرنے کی قیمت پر ہوگا۔

اس مسئلہ کا ایک سادہ حل یہ ہے کہ تفسیر اور معلومات کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔ قرآن کے ساتھ جو تفسیر شائع کی جائے وہ خود تو نصیحت اور تذکیر کے انداز میں ہو۔ اس کے بعد اس سے الگ ایک مستقل کتاب قاموس القرآن یا قرآنی انسائیکلوپیڈیا کے طور پر مرتب کر کے شائع کی جائے۔ اس دوسری کتاب میں وہ تمام فنی بحثیں اور علمی اور تاریخی معلومات ہوں جو قرآنی حوالوں کو تفصیلی انداز میں سمجھنے کے لیے ضروری ہیں مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق آیات کے ذیل میں جو تفسیر لکھی جائے اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کے صرف قابل عبرت پہلوؤں کی وضاحت ہو جن کی طرف قرآن میں اشارے کئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کے بارے میں جو تاریخی اور اثریاتی معلومات ہیں ان کو قاموس القرآن میں جمع کر دیا جائے جن کو آدمی لفظ ابراہیم کے تحت دیکھ سکے۔ اسی طرح نحوی، فقہی، کلامی اور طبیعیاتی

مسائل کی تفصیلات بھی قرآن کی انسائیکلوپیڈیا میں درج ہوں نہ کہ قرآن کی تفسیر میں۔ تذکیر القرآن اسی نہج پر قرآن کی ایک خدمت ہے۔

یہ تفسیری انداز عین وہی ہے جو خود قرآن حکیم نے اختیار کیا ہے۔ قرآن مجید میں طبیعیات اور فلکیات کے حوالے ہیں مگر ان کی تفصیلات کو اللہ تعالیٰ نے چھوڑ دیا کہ بعد کے زمانہ کے اہل علم انہیں خود دریافت کر کے ان کو مدون کریں۔ قرآن میں قدیم شخصیتوں کا ذکر ہے مگر اللہ تعالیٰ نے یہ کام آئندہ آنے والے ماہرین اثریات کے لیے باقی رکھا کہ وہ ان کی تحقیق کریں اور ان کی تاریخی تفصیلات سے دنیا کو آگاہ کریں۔ خدا قرآن مجید میں خود ان تمام واقعات کو شامل کر سکتا تھا۔ مگر وہ صرف اس قیمت پر ہوتا کہ قرآن میں عبرت اور نصیحت کی فضا ختم ہو جائے چنانچہ خدا نے ہر چیز سے باخبر ہونے کے باوجود، سارا زور صرف نصیحت کی باتوں پر دیا اور بقیہ تفصیلات کو دوسروں کے لیے چھوڑ دیا۔ قرآن میں ایک طرف معلومات کی بے شمار تفصیلی باتوں کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ دوسری طرف بنیادی نصیحت والی باتوں کو بار بار دہرایا گیا ہے حتیٰ کہ بہت سے لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا ہے کہ قرآن میں مضامین کی تکرار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا یہ مقصد نہیں کہ لوگ اس کو معلومات کی ایک کتاب سمجھ کر پڑھ لیں۔ قرآن اللہ اور آخرت کی باتوں کو لوگوں کی روح کی غذا بنانا چاہتا ہے۔ کسی چیز کو آدمی معلوماتی طور پر پڑھے تو اس کی تکرار اس کو ناگوار ہو گی۔ مگر جو چیز آدمی کی زندگی میں روح کی غذا بن کر داخل ہو جائے اس کی ہر تکرار آدمی کو نئی لذت دیتی ہے ۔جہاں لذات ہوں وہاں تکرار کا تصور ختم ہو جاتا ہے ۔ قرآن میں یہ انداز اس لئے اختیار کیا گیا تاکہ وہ لوگ چھٹ کر الگ ہو جائیں جو معلومات اور تکرار کی اصطلاحوں میں پڑے ہوئے ہیں اور وہ انسان چن لئے جائیں جنکے لیے قرآنی حقیقتیں لذت روح کا درجہ حاصل کر چکی ہوں۔

تذکیر القرآن میں دعوتی مباحث

قرآن کریم ایک دعوتی کتاب ہے، مولانا وحید الدین نے قرآن کریم کی اس خصوصیت کو اپنی تفسیر کے دیباچہ میں ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے:

> ”قرآن عام طرز کی علمی تصنیف نہیں، وہ ایک دعوتی کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو ساتویں صدی کے ثلث اول میں ایک خاص قوم کے اندر اپنا نمائندہ بنا کر کھڑا کیا اور اس کو اپنے پیغام کی پیغام بری پر مامور فرمایا۔ اس پیغمبر نے اپنے ماحول میں یہ کام شروع کیا اور اسی کے ساتھ قرآن کا تھوڑا تھوڑا حصہ حسب ضرورت اس کے اوپر اترتا رہا۔ یہاں تک کہ ۲۳ سال میں پیغمبر کے دعوتی کام کی تکمیل کے ساتھ قرآن کی بھی تکمیل ہو گئی۔“[۱۱]

مولانا وحید الدین خان لکھتے ہیں کہ قرآن آدمی کو مشن دیتا ہے وہ حقیقتاً کوئی نظام قائم کرنے کا مشن نہیں ہے۔ بلکہ اپنے آپ کو قرآنی کردار کی صورت میں ڈھالنے کا مشن ہے۔ قرآن کا اصل مخاطب فرد ہے نہ کہ سماج۔ اس لیے قرآن کا مشن فرد پر جاری ہوتا ہے نہ کہ سماج پر۔ تاہم افراد کی قابل لحاظ تعداد جب اپنے آپ کو قرآن کے مطابق ڈھالتی ہے تو اس کے سماجی نتائج بھی لازماً نکلنا شروع ہوتے ہیں۔ یہ نتائج ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے بلکہ حالات کے اعتبار سے ان کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔

قرآن میں مختلف انبیاء کے واقعات انہیں سماجی نتائج یا سماجی رد عمل کے مختلف نمونے ہیں اور اگر آدمی نے اپنی آنکھیں کھول رکھی ہیں تو وہ ہر صورت حال کی بابت قرآن میں رہنمائی پاتا چلا جاتا ہے۔ قرآن فطرت انسانی کی کتاب ہے۔ قرآن کو وہی شخص بخوبی طور پر سمجھ سکتا ہے جس کے لیے قرآن اس کی فطرت کا مثنی بنا جائے۔[۱۲]

کفار نے جب دعوت اسلام قبول نہ کی تو اسلام اور پیغمبر اسلام پر طرح طرح کے اعتراض کرنا شروع کر دیئے اور اعتراض بھی بے معنی، جن کی کوئی حیثیت نہیں ہے، قرآن کریم میں مچھر کی مثال دی گئی تو کفار نے کہا کہ اللہ اتنی چھوٹی سے چیز کی مثال کیوں دے رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو جواب ان الفاظ میں دیا:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَن يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ﴾[۱۳]

(اللہ اس سے نہیں شرماتا کہ بیان کرے مثال مچھر کی یا اس سے بھی کسی چھوٹی چیز کی۔ پھر جو ایمان والے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ حق ہے ان کے رب کی جانب سے۔ اور جو منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس مثال کو بیان کرے کے اللہ نے کیا چاہا ہے۔ اللہ اس کے ذریعہ بہتوں کو گم راہ کرتا ہے اور بہتوں کو اس سے راہ دکھاتا ہے۔ اور وہ گم راہ کرتا ہے ان لوگوں کو جو نافرمانی کرنے والے ہیں)

مولانا اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"پیغمبرانہ دعوت کے انتہائی واضح اور مدلل ہونے کے باوجود کیوں بہت سے لوگ اس کو قبول نہیں کر پاتے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ شوشے نکالنے کا فتنہ ہے۔ آدمی کے اندر نصیحت پکڑنے کا ذہن نہ ہو تو وہ کسی بات کو سنجیدگی کے ساتھ نہیں لیتا ایسے آدمی کے سامنے جب بھی کوئی دلیل آتی ہے تو وہ اس کو سطحی طور پر دیکھ کر ایک شوشہ نکال لیتا ہے۔ اس طرح وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ دعوت کوئی معقول دعوت نہیں ہے۔ اگر وہ معقول دعوت ہوتی تو کیسے ممکن تھا کہ اس میں اس قسم کی بے وزن باتیں شامل ہوں۔ مگر جو نصیحت پکڑنے والے ذہن ہیں جو باتوں پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں، ان کو حق کو پہچاننے میں دیر نہیں لگتی۔ خواہ حق کو مچھر جیسی مثالوں ہی میں کیوں نہ بیان کیا گیا ہو۔"[۱۴]

اُمت وسط کا مرتبہ

اسی طرح قبلہ کی تبدیلی پر بھی اعتراض کیا گیا کہ بیت المقدس کی جگہ خانہ کعبہ کو قبلہ کیوں قرار دیا گیا اس کے اندر کیا حکمت ہے۔ بنی اسرائیل کے علماء اور وہ لوگ جنہوں نے نبی کریم ﷺ کے دور اور اسلام کو پایا انہوں نے قبلہ کی تبدیلی کے اندر طرح طرح کے اعتراض کیے، قرآن کریم نے ان کے شکوک و شبہات کو اس طرح بیان کیا ہے:

﴿سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ﴾[۱۵]

(اب بے وقوف لوگ کہیں گے کہ مسلمانوں کو کس چیز نے ان کے قبلہ سے پھر دیا)

مولانا وحید الدین لکھتے ہیں:

" اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو امامت سے معزول کر کے امت محمد کو اس کی جگہ مقرر کر دیا ہے۔ اب قیامت تک بیت المقدس کے بجائے کعبہ خدا کے دین کی دعوت اور خدا پرستوں کے باہمی اتحاد کا عالمی مرکز ہو گا۔ وسط کے معنی بیچ کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اللہ کے پیغام کو اس کے بندوں تک پہنچانے کا درمیانی وسیلہ ہیں۔ اللہ کا پیغام رسول کے ذریعہ ان کو پہنچا ہے۔ اب اس پیغام کو انہیں قیامت تک تمام قوموں کو پہنچاتے رہنا ہے۔ اسی پر دنیا میں بھی ان کے مستقبل کا انحصار ہے اور اسی پر آخرت کا بھی۔"[۱۶]

داعی کی صفات

داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ صبر و حوصلہ اور برداشت سے کام لے۔ اور ہر آنے والی پریشانی اور مشکلات کو صبر و تحمل سے حل کرنے کی کوشش کرے۔ اس لیے قرآن کریم میں آزمائش نیک بندوں کے لیے رکھی گئی ہے، اور صبر کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص خوشخبری کا وعدہ ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ﴾[۱۷]

(اور ہم ضرور تم کو آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے۔ اور ثابت قدم رہنے والوں کو خوش خبری دے دو۔)

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں دعوتی نکات بیان کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

" حق کی راہ میں مشکلات و مصائب کا دوسرا اسبب مومن کا تبلیغی کردار ہے۔ تبلیغ دعوت کا کام نصیحت اور تنقید کا کام ہے۔ اور نصیحت اور تنقید ہمیشہ آدمی کے لیے سب سے زیادہ مبغوض چیز رہی ہے، ان میں بھی نصیحت سننے کے لیے سب سے زیادہ حساس وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے دنیا کے کاروبار کو دین کے نام پر کر رہے ہوں۔ داعی کی ذات اور اس کے پیغام میں ایسے تمام لوگوں کو اپنی حیثیت کی نفی نظر آنے لگتی ہے۔ داعی کا وجود ایک ایسی ترازو بن جاتا ہے جس پر ہر آدمی تل رہا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ داعی بننا بھڑ کے چھتہ میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔ ایسا آدمی اپنے ماحول کے اندر بے جگہ کر دیا جاتا ہے۔ اس کی معاشیات برباد ہو جاتی ہیں۔ اس کی ترقیوں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ حتی کہ اس کی جان تک خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ مگر وہی آدمی راہ پر ہے جس کو بے راہ بتا کر ستایا جائے۔ وہی پاتا ہے جو اللہ کی راہ میں کھوئے۔ وہی جی رہا ہے جو اللہ کی راہ میں اپنی جان دے دے۔ آخرت کی جنت اسی کے لیے ہے جو اللہ کی خاطر دنیا کی جنت سے محروم ہو گیا ہو۔"[۱۸]

درج ذیل آیت کریمہ کی تفسیر میں مولانا نے یہ بتایا ہے کہ ایک داعی کو جن صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور جس رد عمل کا اظہار اس کے خلاف ہوتا ہے تو وہ اس صورت حال میں کیا کرے؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ﴾[۱۹]

(کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تم پر وہ حالات گزرے ہی نہیں جو تمہارے اگلوں پر گزرے تھے۔ ان کو سختی اور تکلیف پہنچی اور وہ ہلا مارے گئے، یہاں تک کہ رسول اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ یاد رکھو، اللہ کی مدد قریب ہے۔)

جنت کی واحد قیمت آدمی کا اپنا وجود ہے۔ آدمی اپنے وجود کو فکر و عمل کے جن نقشوں کے حوالے کیے ہوئے ہے وہاں سے اکھاڑ کر جب وہ اس کو خدا کے نقشہ میں لانا چاہتا ہے تو اس کی پوری شخصیت ہل جاتی ہے۔ اس میں اس وقت اور زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے جب کہ اس کے ساتھ وہ خدا کے دین کا داعی بن کر کھڑا ہو جائے۔ داعی بننا بالفاظ دیگر دوسروں کے اوپر ناصح اور ناقد بننا ہے اور اپنے خلاف نصیحت اور تنقید کو سننا ہر زمانہ میں انسان کے لیے مبغوض ترین امر رہا ہے۔ اس کے نتیجہ میں مدعو کی طرف سے اتنا شدید رد عمل سامنے آتا ہے جو داعی کے لیے ایک بھونچال سے کم نہیں ہوتا۔[20]

﴿وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ﴾[21]

(اور اہل کتاب نے اس میں جو اختلاف کیا وہ آپس کی ضد کی وجہ سے کیا، بعد اس کے کہ ان کو صحیح علم پہنچ چکا تھا۔)

دعوت کو قبول نہ کرنے کی بڑی وجہ ضد اور عناد ہے، مندرجہ بالا آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

قرآن کی دعوت اسی سچے اسلام کی دعوت ہے۔ جو لوگ اس سے اختلاف کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کا حق ہونا ان پر واضح نہیں ہے۔ اس کی وجہ ضد ہے۔ اس کو ماننا انہیں داعی قرآن کی فکری برتری تسلیم کے ہم معنی نظر آتا ہے، اور ان کی حسد اور کبر کی نفسیات اس قسم کا اعتراف کرنے پر راضی نہیں۔ سیدھی طرح حق کو مان لینے کے بجائے وہ چاہتے ہیں کہ اس زبان ہی کو بند کر دیں جو حق کا اعلان کر رہی ہے۔ تاہم خدا کی دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ داعی حق کی زبان کو بند کرنے کے لیے ان کا ہر منصوبہ ناکام ہو گا اور جب خدا کے عدل کا ترازو کھڑا ہو گا تو وہ دیکھ لیں گے کہ ان کے وہ اعمال کس قدر بے قیمت تھے جن کے بل پر وہ اپنی نجات اور کامیابی کا یقین کیے ہوئے تھے۔ سچی دلیل خدا کی نشانی ہے۔ جو شخص دلیل کے سامنے نہیں جھکتا وہ گویا خدا کے سامنے نہیں جھکتا۔ ایسے لوگ قیامت میں اس طرح اٹھیں گے کہ وہ سب سے زیادہ بے سہارا ہوں گے۔[22]

دعوتی کلام واسلوب ناصحانہ کلام ہوتا ہے نہ کہ مناظرانہ کلام، اسی کی وضاحت کرتے ہوئے درج ذیل آیت مبارکہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾[23]

(اور ضرور ہے کہ تم میں ایک گروہ ہو جو نیکی کی طرف بلائے، وہ بھلائی کا حکم دے اور برائی سے روکے اور ایسے ہی لوگ کامیاب ہونگے۔)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ﴾[24]

(اور تم اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر اس طریقہ پر جو بہتر ہے)

داعی کے لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ بحث کریں اور الجھیں ان سے وہ سلام کر کے جدا ہو جائے۔ اور جو لوگ سنجیدہ ہوں ان پر وہ امر حق کو واضح کرنے کی کوشش کرے۔ نیز یہ کہ دعوتی کلام کو حکیمانہ کلام ہونا چاہیے۔ اور حکیمانہ کلام کی ایک خاص پہچان یہ ہے کہ اس میں مدعو کی نفسیات کا پورا لحاظ کیا جاتا ہے۔ داعی اپنی بات کو ایسے اسلوب سے کہتا ہے کہ مدعو اس کو اپنے دل کی بات سمجھے نہ کہ غیر کی بات سمجھ کر اس سے متوحش ہو جائے۔ داعیانہ کلام ناصحانہ کلام ہوتا ہے نہ کہ مناظرانہ کلام۔

مدعو کی صفات

تم میں ایک گروہ ہو جو دعوت الی الخیر کا کام کرے اور نیکیوں کا حکم دے اور برائیوں سے روکے " یہ ارشاد بیک وقت دو باتوں کو بتا رہا ہے۔ ایک کا تعلق خواص سے ہے اور دوسری کا تعلق عوام سے۔ امت کے خواص کے اندر یہ روح ہونی چاہیے کہ وہ امت کے اندر برائی کو برداشت نہ کریں، وہ نیکی اور بھلائی کے لیے تڑپنے والے ہوں۔ ان کا یہ جذبہ اصلاح انہیں مجبور کرے گا کہ وہ لوگوں کے احوال سے غیر متعلق نہ رہیں وہ اپنے بھائیوں کو نیک راہ پر چلنے کے لیے اکسائیں اور انہیں برائی سے دور رہنے کی تلقین کریں۔ تاہم اس عمل کی کامیابی کے لیے امت کے عوام کے اندر اطاعت کا جذبہ ہونا بھی لازماً ضروری ہے۔ عوام کو چاہیے کہ وہ اپنے خواص کا احترام کریں۔ وہ ان کے کہنے سے چلیں اور جہاں وہ روکیں وہاں وہ رک جائیں۔ وہ اپنے آپ کو اپنے دینی ذمہ داروں کے حوالے کر دیں۔ جس مسلم گروہ میں خواص اور عوام کا یہ حال ہو وہی فلاح پانے والا گروہ ہے۔ سمع وطاعت کی اس فضا ہی میں کسی معاشرہ کے اندر وہ اوصاف جنم لیتے ہیں جو اس کو دنیا میں طاقتور اور آخرت میں نجات یافتہ بناتے ہیں۔[۲۵]

اسی مضمون کو دوسرے مقام پر یوں بیان کیا گیا:

﴿وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُم ۚ مِّنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ ﴾[۲۶]

(اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لاتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا۔ ان میں سے کچھ ایمان والے ہیں اور ان میں اکثر نافرمان ہیں۔)

یہود دین خداوندی کے حامل بنائے گئے تھے۔ مگر وہ اس کو لے کر کھڑے نہ ہو سکے اور اس کو محفوظ رکھنے میں بھی ناکام رہے۔ اس کے بعد اللہ نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذریعہ اپنا دین اس کی صحیح صورت میں بھیجا۔ اب امت مسلمہ لوگوں کے درمیان خدا کی رہنمائی کے لیے کھڑی ہوئی ہے۔ اس منصب کا تقاضا ہے کہ یہ امت اللہ کی سچی مومن بنے۔ وہ دنیا کو بھلائی کی تلقین کرے اور ان چیزوں سے باخبر کرے جو اللہ کے نزدیک برائی کی حیثیت رکھتی ہیں یہ کام چونکہ خدائی کام ہے اس لیے خدا نے اس کے ساتھ اپنا تحفظاتی نظام بھی شامل کر دیا ہے۔ جو لوگ اس کار خداوندی کے لیے اٹھیں گے ان کے لیے خدا کی ضمانت ہے کہ ان کے مخالفین ان کو معمولی اذیتوں کے سوا کوئی حقیقی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ تاہم یہود کے انجام کی صورت میں اس کی بھی دائمی مثال قائم کر دی گئی کہ اس منصب حق پر سرفراز کیے جانے کے بعد جو لوگ بدعہدی

کریں ان کی سزا اسی دنیا میں اس طرح شروع ہو جاتی ہے کہ ان کو ذاتی عزت و سرفرازی سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ خدا کی رحمتوں سے محرومی کی وجہ سے ان کی بے حسی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ ان لوگوں کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں جو ان کی کوتاہیوں کی طرف متوجہ کرنے کے لیے اٹھیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِندِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ ۖ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ ۖ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا﴾[۲۷]

(اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو قبول ہے۔ پھر جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ اس کے خلاف مشورہ کرتا ہے جو وہ کہہ چکا تھا۔ اور اللہ ان کی سرگوشیوں کو لکھ رہا ہے۔ پس تم ان سے اعراض کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو، اور اللہ بھروسہ کے لیے کافی ہے۔)

اس آیت مبارکہ کے دعوتی مباحث بیان کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

''خدا کے داعی کو ماننا "اپنے جیسے انسان" کو ماننا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی خدا کو مان لیتا ہے مگر وہ خدا کے داعی کو پہچانے اور اس کی جانب اپنے کو کھڑا کرے۔ داعی کے معاملہ کو جب آدمی خدا کا معاملہ نہ سمجھے تو وہ اس کے بارے میں سنجیدہ بھی نہیں ہوتا۔ سامنے وہ رسمی طور پر ہاں کر دیتا ہے مگر جب الگ ہوتا ہے تو اپنی سابقہ روش پر چلنے لگتا ہے۔ وہ اس کے خلاف ایسی باتیں پھیلاتا ہے جن کا پھیلانا سراسر غیر ذمہ دارانہ فعل ہو۔ جو لوگ خدا کے داعی کے ساتھ اس قسم کا بے پروائی کا سلوک کریں وہ خدا کے یہاں یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکتے کہ ہم نہیں جانتے تھے۔ آدمی اگر ٹھہر کر سوچے تو داعی کی صداقت کو جاننے کے لیے وہ کلام ہی کافی ہے جو خدا نے اس کی زبان پر جاری کیا ہے۔''[۲۸]

ارشاد الٰہی ہے:

﴿ لَّا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴾[۲۹]

(ان کی اکثر سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں۔ بھلائی والی سرگوشی صرف اس کی ہے جو صدقہ کرنے کو کہے یا کسی نیک کام کے لیے کہے یا لوگوں میں صلح کرانے کے لیے کہے۔ جو شخص اللہ کی خوشی کے لیے ایسا کرے تو ہم اس کو بڑا اجر عطا کریں گے۔)

اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں مولانا وحید الدین نے درج ذیل دعوتی نکات ذکر کیے ہیں:

حق کی بے آمیز دعوت جب اٹھتی ہے تو وہ زمین پر خدا کا ترازو کھڑا کرنا ہوتا ہے۔ اس کی میزان میں ہر آدمی اپنے کو تلتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ حق کی دعوت ہر ایک کے اوپر سے اس کا ظاہری پردہ اتار دیتی ہے اور ہر شخص کو اس کے اس مقام پر کھڑا کر دیتی ہے جہاں وہ باعتبار حقیقت تھا۔ یہ صورت حال اتنی سخت ہوتی ہے کہ لوگ چیخ اٹھتے ہیں۔ سارا ماحول داعی کے لیے ایسا

بن جاتا ہے جیسے وہ انگاروں کے درمیان کھڑا ہوا ہو۔ جو لوگ دعوت حق کے ترازوں میں اپنے کو بے وزن ہوتا ہوا محسوس کرتے ہیں ان کے اندر ضد اور گھمنڈ کے جذبات جاگ اٹھتے ہیں۔ وہ تیزی سے مخالفانہ رخ پر چل پڑتے ہیں۔ وہ چاہنے لگتے ہیں کہ ایسی دعوت کو مٹادیں جو ان کی حق پرستانہ حیثیت کو مشتبہ ثابت کرتی ہو۔ ان کے لیے اپنی زبان کا استعمال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ دعوت اور داعی کے خلاف جھوٹی باتیں پھیلائیں۔ اس کو زیر کرنے کے منصوبے بنائیں۔ وہ لوگوں کو منع کریں کہ اس کی مالی مدد نہ کرو۔ جو اللہ کے بندے اللہ کی رسی کے گرد متحد ہو رہے ہوں ان کو بدگمانیوں میں مبتلا کر کے منتشر کریں۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنی فطرت کو زندہ رکھے ہوئے تھے ان کو اللہ کی مدد سے یہ توفیق ملتی ہے کہ وہ اس کے آگے جھک جائیں، وہ اس کا ساتھ دیں، وہ اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنا شروع کر دیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ان کی زبان کا استعمال یہ ہوتا ہے کہ وہ کھلے طور پر سچائی کا اعتراف کرلیں۔ وہ لوگوں سے کہیں کہ یہ اللہ کا کام ہے اس میں اپنا مال اور اپنا وقت خرچ کرو۔ وہ لوگوں کو ترغیب دیں کہ وہ اپنی قوتوں کو نیکی اور بھلائی کے کاموں میں لگائیں۔ وہ آپس کی رنجشوں اور شکایتوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ حق کا اعتراف ان کے اندر جو نفسیات جگاتا ہے اس کا قدرتی نتیجہ ہے کہ وہ اس قسم کے کاموں میں لگ جائیں۔ اللہ کے نزدیک یہ ایک ناقابل معافی جرم ہے کہ حق کی دعوت کی مخالفت کی جائے اور جو لوگ حق کی دعوت کے گرد جمع ہوئے ہیں ان کو اپنی دشمنی کی آگ میں جلانے کی کوشش کی جائے۔ دوسرے اکثر گناہوں میں یہ امکان رہتا ہے کہ وہ انسان کی غفلت یا کمزوری کی وجہ سے صادر ہوئے ہوں۔ مگر دعوت حق کی مخالفت تمام تر سرکشی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور سرکشی کسی آدمی کا وہ جرم ہے جس کو اللہ کبھی معاف نہیں کرتا، الا یہ کہ وہ اپنی غلطی کا اقرار کرے اور سرکشی سے باز آجائے۔ دین کی دعوت جب بھی اپنے بے آمیز شکل میں اٹھتی ہے تو وہ ایک خدائی کام ہوتا ہے جو خدا کی خصوصی مدد پر شروع ہوتا ہے۔ ایسے کام کی مخالفت کرنا گویا خدا کے مقابلہ میں کھڑا ہونا ہے اور کون ہے جو خدا کے مقابلہ میں کھڑا ہو کر کامیاب ہو۔[۳۰]

درج ذیل آیت مبارکہ میں نبی کریم ﷺ کو فریضۂ رسالت کی ادائیگی کا حکم دیا گیا، ارشاد ربانی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ﴾[۳۱]

(اے پیغمبر، جو کچھ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے تم اس کو پہنچادو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔ اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔ اللہ یقیناً منکر لوگوں کو راہ نہیں دیتا۔)

مولانا اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب عرب میں آئے تو ایسا نہ تھا کہ وہاں دین کا نام لینے والا کوئی نہ ہو۔ بلکہ ان کا سارا معاشرہ دین ہی کے نام پر قائم تھا۔ دین کے نام پر بہت سے لوگ پیشوائی اور قیادت کا مقام حاصل کیے ہوئے تھے۔ دین کے نام پر لوگوں کو بڑی بڑی رقمیں ملتی تھیں۔ دینی مناصب کا حامل ہونا معاشرہ میں عزت اور فخر کی علامت بنا ہوا تھا۔ اس کے باوجود آپ کو عرب کے لوگوں کی طرف سخت ترین مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دین خداوندی کے نام پر ان کے یہاں ایک خود ساختہ دین رائج ہو گیا تھا۔ صدیوں کی روایات کے نتیجہ میں اس دین کے نام پر گدیاں بن گئی تھیں اور مرفادات کی بہت سی صورتیں قائم ہو گئی

تھیں۔ ایسے ماحول میں جب پیغمبر اسلام نے بے آمیز دین کی دعوت پیش کی تو لوگوں کو نظر آیا کہ وہ ان کی دینی حیثیت کو بے اعتبار ثابت کر رہی ہے۔ ان کو اندیشہ ہو کہ اگر یہ دین پھیلا تو ان کا وہ مذہبی ڈھانچہ ڈھ جائے گا جس میں ان کو بڑائی کا مقام ملا ہوا ہے''۔

یہ صورت حال داعی کے لیے بہت سخت ہوتی ہے۔ اپنے دعوتی کام کو کھلے طور پر انجام دینا وقت کی مذہبی طاقتوں سے لڑنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ اس کو دکھائی دیتا ہے کہ اگر میں کسی مصالحت کے بغیر سچے دین کی تبلیغ کروں تو مجھ کو سخت ترین ردعمل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میرا مذاق اڑایا جائے گا۔ مجھ کو بے عزت کیا جائے گا۔ میری معاشیات تباہ کی جائیں گی۔ میرے خلاف جارحانہ کارروائیاں ہوں گی۔ میں اعوان و انصار سے محروم ہو جاؤں گا۔

اب اس کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں۔ دعوتی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں دنیوی مصلحتوں کے سرے ہاتھ سے چھوٹتے ہیں۔ اور اگر دنیوی مصلحتوں کا لحاظ کیا جائے تو دعوتی عمل کی پوری انجام وہی ناممکن نظر آتی ہے۔ یہاں خدا کا وعدہ داعی کو یکسو کرتا ہے۔ خدا کا وعدہ ہے کہ داعی اگر اپنے آپ کو خدا کے پیغام کی پیغام رسانی میں لگا دے تو لوگوں کی طرف سے ڈالی جانے والی مشکلات میں خدا اس کے لیے کافی ہو جائے گا۔ داعی کو چاہیے کہ وہ صرف دعوت کے تقاضوں کی تکمیل میں لگ جائے اور مدعو قوم کی طرف سے ڈالے جانے والے مصائب میں وہ خدا پر بھروسہ کرے۔

مخاطبین کا ردعمل ایک فطری چیز ہے اور داعی کو بہر حال اس سے سابقہ پیش آتا ہے۔ مگر اس کا اثر اسی دائرہ تک محدود رہتا ہے جتنا خدا کے قانون آزمائش کا تقاضا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ مخالفین اس حد تک قابو یافتہ ہو جائیں کہ وہ دعوتی مہم کو روک دیں یا اس کو تکمیل تک پہنچنے نہ دیں۔ ایک سچی دعوت کا اپنے دعوتی نشانہ تک پہنچنا ایک خدائی منصوبہ ہوتا ہے اس لیے وہ لازماً پورا ہو کر رہتا ہے۔ اس کے بعد مدعو گروہ کا ماننا اس کی اپنی ذمہ داری ہے جو اسی کے بقدر نتیجہ خیز ہوتی ہے جتنا مدعوی خود چاہتا ہو۔[32]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ۭ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَي الْعٰلَمِيْنَ﴾[33]

(اور اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو بھی، اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے دنیا والوں پر فضیلت عطا کی۔)

"فضیلت" کسی کا نسلی یا قومی لقب نہیں، یہ اللہ کا ایک عطیہ ہے جس کا تحقق صرف ان افراد کے لیے ہوتا ہے جو خدا کی ہدایت کے مطابق اپنے کو صالح بنائیں، شرک کی تمام قسموں سے اپنے کو بچائیں اور " بلا معاوضہ نصیحت " کے دعوتی منصوبہ میں اپنے کو ہمہ تن شامل کریں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کی کتاب کو اپنا حقیقی رہنما بناتے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ اپنے وجود کو اتنا زیادہ شامل کر دیتے ہیں کہ ان پر اس راہ کے وہ بھید کھلنے لگتے ہیں جن کو حکمت کہا جاتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو خدا چن لیتا ہے اور ان میں سے جن کو چاہتا ہے اپنے دین کی پیغام رسانی کی توفیق دیتا ہے، دور نبوت میں اللہ کے خصوصی پیغمبر کی حیثیت سے اور ختم نبوت کے بعد اللہ کے عام داعی کی حیثیت سے۔ اللہ کا انعام خواہ وہ پیغمبروں کے لیے ہو یا عام انسانوں کے لیے، تمام تر نیک عملی (احسان) کی بنیاد پر ملتا ہے نہ کہ کسی اور بنیاد پر۔ دعوت حق کا کام صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو اس کی خاطر اتنا زیادہ یکسو اور بے نفس ہو چکے ہوں کہ وہ مدعو سے کسی قسم کی مادی توقع نہ رکھیں۔ جس شخص یا گروہ تک آپ آخرت کا

پیغام پہنچا رہے ہوں اسی سے آپ اپنے دنیوی حقوق کے لیے احتجاج اور مطالبات کی مہم نہیں چلا سکتے۔ داعی کا ایسا کرنا صرف اس قیمت پر ہوگا کہ اس کی دعوت مدعو کی نظر میں مضحکہ خیز بن کر رہ جائے اور ماحول کے اندر کبھی اس کو سنجیدہ مہم کی حیثیت حاصل نہ ہو۔[۳۴]

ارشادِ ربانی ہے:

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴾[۳۵]

(درگزر کرو، نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے نہ الجھو۔)

مولانا وحید الدین خان کی تفسیر میں جا بجا دعوتی پہلو نمایاں ہیں تاہم ایسی آیات مبارکہ جن میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر، دعوت، اصلاح اور تذکیر کے مضامین بیان ہوئے ہیں وہاں جامعیت کے ساتھ مولانا نے دعوتی نکات ذکر کیے ہیں، مثلاً اس آیت مبارکہ میں فضیلت کا معیار اور اس کی خاصیت و خصائص کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

توحید اور آخرت، نیکی اور عدل کی طرف بلانا "عرف" کی طرف بلانا ہے۔ یعنی ان بھلائیوں کی طرف جو عقل و فطرت کے نزدیک جانی پہچانی ہیں۔ مگر یہ سادہ ترین کام ہر زمانہ میں مشکل ترین کام رہا ہے۔ انسان کی حب عاجلہ کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر زمانہ میں لوگ اپنی زندگی کا نظام دنیوی مفاد اور ذاتی مصلحتوں کی بنیاد پر قائم کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ حق کا نام لے کر باطل پرستی کے مشغلہ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں جب بھی سچائی کے بے آمیز دعوت اٹھتی ہے تو ہر آدمی اپنے آپ پر اس کی زد پڑتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر آدمی اس کا مخالف بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

ایسی حالت میں داعی کو کیا کرنا چاہیے۔ اس کا ایک ہی جواب ہے اور وہ ہے درگزر اور اعراض۔ یعنی لوگوں سے الجھے بغیر بالکل ٹھنڈے طور پر اپنا کام جاری رکھنا۔ داعی اگر لوگوں کے نکالے ہوئے شوشوں کا جواب دینے لگے تو حق کی دعوت مناظرہ اختیار کرلے گی۔ داعی اگر لوگوں کی طرف سے چھیڑے ہوئے غیر ضروری سوالات میں اپنے کو مشغول کرے تو وہ صرف اپنے وقت اور اپنی طاقت کو ضائع کرے گا۔ داعی اگر لوگوں کی طرف سے آنے والی تکلیفوں پر ان سے جھگڑنے لگے تو دعوت حق دعوت حق نہ رہے گی بلکہ معاشی اور سیاسی لڑائی بن جائے گی۔ اس لیے حق کی دعوت کو اس کی اصلی صورت میں باقی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ داعی جاہلوں اور معاندوں کی طرف سے پیش آنے والی ناخوش گواریوں پر صبر کرے اور ان سے الجھے بغیر اپنے مثبت کام کو جاری رکھے۔ تاہم موجودہ دنیا میں کوئی شخص نفس اور شیطان کے حملوں سے خالی نہیں رہ سکتا۔ ایسے موقع پر جو چیز آدمی کو بچاتی ہے وہ صرف اللہ کا ڈر ہے۔ اللہ کا ڈر آدمی کو بے حد حساس بنا دیتا ہے۔ یہی حساسیت موجودہ امتحان کی دنیا میں آدمی کی سب سے بڑی ڈھال ہے۔ جب بھی آدمی کے اندر کوئی غلط خیال آتا ہے یا کسی قسم کی منفی نفسیات ابھرتی ہے تو اس کی حساسیت فوراً اس کو بتا دیتی ہے کہ وہ پھسل گیا ہے۔ ایک لمحہ کی غفلت کے بعد اس کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ اللہ سے معافی مانگتے ہوئے دوبارہ اپنے کو درست کرلیتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اللہ کے ڈر سے خالی ہوتے ہیں ان کے اندر شیطان داخل ہو کر اپنا کام کرتا رہتا ہے اور ان کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ بن کر وہ کس گڑھے کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ حساسیت آدمی کی سب سے بڑی محافظ ہے جب کہ بے حسی آدمی کو شیطان کے مقابلہ میں غیر محفوظ بنا دیتی ہے۔[۳۶]

درج آیت مبارکہ کے تحت دعوتی نکات بیان کیے گئے ہیں:

﴿ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا أَنَا عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ ﴾[۳۷]

(کہو، اے لوگو، تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس حق آگیا ہے۔ جو ہدایت قبول کرے گا، وہ اپنے ہی لیے کرے گا اور جو بھٹکے گا تو اس کا وبال اسی پر آئے گا، اور میں تمہارے اوپر ذمہ دار نہیں ہوں۔)

مولانا لکھتے ہیں:

''دعوت کا کام اصلاً اعلان حق کا کام ہے۔ کسی گروہ کے اوپر اس وقت پیغام رسانی کا حق ادا ہو جاتا ہے جب کہ داعی امر حق کو دلیل کے ذریعہ پوری طرح واضح کر دے اور اسی کے ساتھ اس بات کا ثبوت دیدے کہ وہ اس معاملہ میں پوری طرح سنجیدہ ہے۔ داعی اگر وقت کے معیار کے مطابق امر حق کو مدلل کر دے۔ وہ نفع نقصان سے بے نیاز ہو کر حق کی مکمل گواہی دیدے۔ وہ ہر تکلیف اور ناخوش گواری کو برداشت کرتا ہوا اپنے دعوتی کام کو جاری رکھے تو اس کے بعد مخاطب کے اوپر وہ اتمام حجت ہو جاتا ہے جس کے بعد خدا کے یہاں کسی کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے۔ داعی کا کام اصلاً اتباع وحی ہے۔ یعنی اپنی ذات کی حد تک عملاً مرضی رب پر قائم رہتے ہوئے دوسروں کو مرضی رب کی طرف پکارتے رہنا۔ اس کام کو ہر حال میں حکمت اور صبر اور خیر خواہی کے ساتھ مسلسل جاری رکھنا ہے۔ اس کے بعد جتنے بقیہ مراحل ہیں وہ سب براہ راست طور پر خدا سے متعلق ہیں۔ داعی کی طرف سے کوئی دوسرا عملی اقدام صرف اس وقت درست ہے جب کہ خود خدا کی طرف سے اس کا فیصلہ کیا جا چکا ہو اور اس کے آثار ظاہر ہو جائیں۔ خدا کا فیصلہ ہمیشہ حالات کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ جب خدا کے علم میں داعی کا دعوتی کام مطلوب حد کو پہنچ چکا ہوتا ہے تو خدا حالات میں ایسی تبدیلیاں پیدا کرتا ہے جس کو استعمال کر کے داعی اپنے عمل کے اگلے مرحلہ میں داخل ہو جائے۔''[۳۸]

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾[۳۹]

(اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے اچھے طریقہ سے بحث کرو۔)

دعوت کا عمل ایک ایسا عمل ہے جو انتہائی سنجیدگی اور خیر خواہی کے جذبہ کے تحت ابھرتا ہے۔ خدا کے سامنے جواب دہی کا احساس آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ خدا کے بندوں کے سامنے داعی بن کر کھڑا ہو۔ وہ دوسروں کو اس لیے پکارتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے اگر میں نے ایسا نہ کیا تو میں قیامت کے دن پکڑا جاؤں گا۔ اس نفسیات کا قدرتی نتیجہ ہے کہ آدمی کا دعوتی عمل وہ انداز اختیار کر لیتا ہے جس کو حکمت، موعظت حسنہ اور جدال احسن کہا گیا ہے۔

مولانا وحید الدین خان قرآنی اصول دعوت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حکمت سے مراد دلیل و برہان ہے۔ کوئی دعوتی عمل اسی وقت حقیقی دعوتی عمل ہے جب کہ وہ ایسے دلائل کے ساتھ ہو جس میں مخاطب کے ذہن کی پوری رعایت شامل ہو۔ مخاطب کے نزدیک "کسی چیز کے ثابت شدہ چیز ہونے کی جو شرائط ہیں، ان شرائط کی تکمیل کے ساتھ جو کلام کیا جائے اسی کو یہاں حکمت کا کلام کہا گیا ہے۔ جس کلام میں مخاطب کی ذہنی و

فکری رعایت شامل نہ ہو وہ غیر حکیمانہ کلام ہے۔ اور ایسا کلام کسی کو داعی کا مرتبہ نہیں دے سکتا۔ موعظتِ حسنہ اس خصوصیت کا نام ہے جو دردمندی اور خیر خواہی کی نفسیات سے کسی کے کلام میں پیدا ہوتی ہے۔ جس داعی کا یہ حال ہو کہ خدا کے عظمت و جلال کے احساس سے اس کی شخصیت کے اندر بھونچال آگیا ہو جب وہ خدا کے بارے میں بولے گا تو یقینی طور پر اس کے کلام میں عظمت خداوندی کی بجلیاں چمک اٹھیں گی جو داعی جنت اور جہنم کو دیکھ کر دوسروں کو اسے دکھانے کے لیے اٹھے۔ اس کے کلام میں یقینی طور پر جنت کی بہاریں اور جہنم کی ہولناکیاں گونجتی ہوئی نظر آئیں گی۔ ان چیزوں کی آمیزش داعی کے کلام کو ایسا بنادے گی جو دلوں کو پگھلادے اور آنکھوں کو اشک بار کردے۔''

دعوتی کلام کی ایجابی خصوصیات یہی دو ہیں۔ حکمت اور موعظت حسنہ۔ تاہم ہمیشہ دنیا میں کچھ ایسے لوگ موجود رہتے ہیں جو غیر ضروری بحثیں کرتے ہیں۔ جن کا مقصد الجھانا ہوتا ہے نہ کہ سمجھنا سمجھانا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں مذکورہ قسم کا داعی جو انداز اختیار کرتا ہے، اسی کا نام جدال بالتی ہی احسن ہے۔ وہ ٹیڑھی وہ الزام تراشی کے مقابلہ میں استدلال اور تجزیہ کا انداز اختیار کرتا ہے۔ وہ اشتعال کے اسلوب کے جواب میں صبر کا اسلوب اختیار کرتا ہے۔ داعی حق کی نظر سامنے کے انسان کی طرف نہیں ہوتی بلکہ اس خدا کی طرف ہوتی ہے جو سب کے اوپر ہے۔ اس لیے وہ وہی بات کہتا ہے جو خدا کی میزان میں حقیقی بات ٹھہرے نہ کہ انسان کی میزان میں۔[۴۰]

یہاں داعی کا وہ کردار بتایا گیا ہے جو مخالفین کے مقابلہ میں اس کو اختیار کرنا ہے۔ فرمایا کہ اگر مخالفین کی طرف سے ایسی تکلیف پہنچے جس کو تم برداشت نہ کرسکو تو تم کو اتنا ہی کرنے کی اجازت ہے جتنا تمہارے ساتھ کیا گیا ہے۔ تاہم یہ اجازت صرف انسان کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے بطور رعایت ہے۔ ورنہ داعی کا اصل کردار تو یہ ہونا چاہیے کہ وہ مدعو کی طرف سے پیش آنے والی ہر تکلیف پر صبر کرے۔ وہ مدعو سے حساب چکانے کے بجائے ایسے تمام معاملات کو خدا کے خانہ میں ڈال دے۔

مخاطب اگر حق کو نہ مانے۔ وہ اس کو مٹانے کے درپے ہو جائے تو اس وقت داعی کو سب سے بڑی تدبیر جو کرنی وہ صبر ہے۔ یعنی رد عمل کی نفسیات یا جواب کاروائیوں سے بچتے ہوئے مثبت طور پر حق کا پیغام پہنچاتے رہنا۔ داعی کو اصلاً جو ثبوت دیتا ہے وہ یہ کہ وہ فی الواقع اللہ سے ڈرنے والا ہے۔ اس کے اندر وہ کردار پیدا ہو چکا ہے جو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ آدمی دنیا کے پردوں سے گذر کر خدا کو اس کی چھپی ہوئی عظمتوں کے ساتھ دیکھ لے۔ اگر داعی یہ ثبوت دے دے تو اس کے بعد بقیہ امور میں خدا اس کی طرف سے کافی ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دعوت کے مخالفین کی کوئی تدبیر داعی کو نقصان نہیں پہنچا سکتی، خواہ وہ تدبیر کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔

دنیا میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کی نگاہیں انسانوں میں اٹکی ہوئی ہوں۔ جن کو بس انسانوں کی کارروائیاں دکھائی دیتی ہوں۔ دوسرے وہ لوگ جن کی نگاہیں خدا میں اٹکی ہوئی ہوں۔ جو خدا کی طاقتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ پہلی قسم کے لوگ کبھی صبر پر قادر نہیں ہوسکتے۔ یہ صرف دوسری قسم کے انسان ہیں جن کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ شکایتوں اور تلخیوں کو سہہ لیں۔ اور جو کچھ خدا کی طرف سے ملنے والا ہے اس کی خاطر اس کو نظر انداز کردیں جو انسان کی طرف سے مل رہا ہے۔

داعی کو جس طرح جوابی نفسیات سے پرہیز کرنا ہے اسی طرح اس کو جوابی کارروائی سے بھی اپنے آپ کو بچانا ہے۔ مخالفین کی سازشیں اور تدبیریں بظاہر ڈراتی ہیں کہ کہیں وہ دعوت اور داعی کو تہس نہس نہ کر ڈالیں۔ مگر داعی کو ہر حال میں خدا پر بھروسہ رکھنا ہے۔ اس کو یہ یقین رکھنا ہے کہ خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اور وہ یقیناً دعوت حق کا ساتھ دے کر باطل پرستوں کو ناکام بنا دے گا۔[41]

﴿اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى﴾[42]

(بلکہ ایسے شخص کی نصیحت کے لیے جو ڈرتا ہو۔)

مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں مولانا لکھتے ہیں:

''قرآن اگرچہ صرف ایک یاد دہانی ہے۔ مگر وہ مدعو کے لیے قابل حجت یاد دہانی اس وقت بنتا ہے جب کہ اس کی دعوت دینے والا اپنے آپ کو اس کی راہ میں کھپا دے۔ دوسروں کی خیر خواہی میں وہ اپنے آپ کو اس حد تک نظر انداز کر دے کہ یہ کہا جائے کہ اس نے تو لوگوں کو حق کی راہ پر لانے کی خاطر اپنے آپ کو مشقت میں ڈال لیا''۔

تاہم دعوت کو خواہ کتنا ہی کامل اور معیار انداز میں پیش کر دیا جائے، عملاً اس سے ہدایت صرف اس بندہ خدا کو ملتی ہے جو حق شناس ہو۔ جس کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ دلیل کی سطح پر بات کا واضح ہونا ہی اس کی آنکھ کھولنے کے لیے کافی ہو جائے۔[43]

جس ہستی نے عالم کی تخلیق کی ہے اسی نے قرآن کو بھی نازل کیا ہے۔ اس لیے قرآن اور فطرت میں کوئی تضاد نہیں۔ قرآن ایک ایسی حقیقت کی یاد دہانی ہے جس کو پہچاننے کی صلاحیت فطرت انسانی کے اندر پہلے سے موجود ہے۔

﴿قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ﴾[44]

(موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے رب، میرے سینہ کو میرے لیے کھول دے۔)

داعی کے لیے سینہ کا کھلنا یہ ہے کہ حسب موقع اس کے اندر موثر مضامین کا ورود ہو۔ معاملہ کا آسان ہونا یہ ہے کہ مخالفین کبھی دعوت کی راہ بند کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ زبان کی گرہ کھلنا یہ ہے کہ بڑے بڑے مجمع میں بلا جھجھک دعوت پیش کرنے کا ملکہ پیدا ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو پیغمبرانہ ذمہ داری ادا کرنے کے لیے یہ سب کچھ دیا۔ اسی کے ساتھ ان کی درخواست کے مطابق ان کے بھائی کو ان کے لیے ایک طاقتور معاون بنا دیا۔ نصرت کا یہ خصوصی معاملہ جو پیغمبر کے ساتھ کیا گیا۔ یہی غیر پیغمبر داعی کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ دعوت کے کام سے اپنے آپ کو اس طرح کامل طور پر وابستہ کرے جس طرح پیغمبر نے اپنے آپ کو کامل طور پر وابستہ کیا تھا۔

﴿وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ﴾[45]

(اور تم دونوں میری یاد میں سستی نہ کرنا۔)

خدا کے ذکر سے مراد یہ ہے کہ آدمی کے قلب و دماغ میں خدا یقین اس طرح شامل ہو گیا ہو کہ وہ بار بار اسے یاد آتا رہے۔ آدمی کا ہر مشاہدہ اور اس کی زندگی کا ہر واقعہ اس کے خدائی شعور سے جڑ کر اس کو جگانے والا بن جائے۔ عام انسان مادی غذاؤں پر جیتے ہیں۔ حق کا داعی خدا کی یاد میں جیتا ہے۔ خدا کی یاد مومن کا سرمایہ اور اسی طرح داعی کا بھی۔

دوسری ضروری چیز دعوت میں نرم انداز اختیار کرنا ہے۔ فرعون جیسے سرکش انسان کے سامنے بھیجتے ہوئے یہ ہدایت کرنا ثابت کرتا ہے کہ دعوت کے لیے نرم اور حکیمانہ انداز مطلق طور پر مطلوب ہے۔ مدعو کی طرف سے کوئی بھی سختی یا سرکشی داعی کو یہ حق نہیں دیتی کہ وہ اپنی دعوت میں نرمی اور شفقت کا انداز کھو دے۔

﴿ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۚ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ﴾[۴۶]

(تم برائی کو اس طریقے سے دفع کرو جو بہتر ہو، ہم ان باتوں کو خوب جانتے ہیں جو یہ بیان کرتے ہیں)

اس آیت مبارکہ سے دعوتی مباحث اخذ کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

خدا کا داعی جب لوگوں کو حق کی طرف بلاتا ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اس کے دشمن بن جاتے ہیں۔ وہ اس کے خلاف جھوٹے پروپگنڈے کرتے ہیں۔ وہ اس کو اپنے شر کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس وقت داعی کے اندر بھی جوابی ذہن ابھرتا ہے۔ اس کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ جن لوگوں نے تمہارے ساتھ برا سلوک کیا ہے تم بھی ان کے ساتھ برا سلوک کرو۔ اگر تم خاموش رہے تو ان کے حوصلے بڑھیں گے اور وہ مزید مخالفانہ کارروائی کرنے کے لیے دلیر ہو جائیں گے۔

مگر اس قسم کے خیالات شیطان کا وسوسہ ہیں۔ شیطان اس نازک موقع پر آدمی کو بہکاتا ہے۔ تاکہ اس کو راہ سے بے راہ کر دے۔ ایسے موقع پر داعی اور مومن کو چاہیے کہ وہ شیطانی بہکاؤوں کے مقابلہ میں خدا کی پناہ مانگے۔ نہ کہ شیطانی بہکاؤوں کو مان کر اپنے مخالفین کے خلاف انتقامی کارروائیاں کرنے لگے۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾[۴۷]

(اور اللہ کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ سفارش کا اختیار نہیں رکھتے، مگر وہ جو حق کی گواہی دیں گے اور وہ جانتے ہونگے۔)

اس آیت مبارکہ کی تفسیر کے ضمن میں مولانا لکھتے ہیں:

> ''قیامت میں پیغمبر اور داعیان حق جو شفاعت کریں گے وہ حقیقۃً شفاعت نہیں ہے بلکہ شہادت ہے۔ یعنی ایسی بات کی گواہی دینا جس کو آدمی ذاتی طور پر جانتا ہو۔ آخرت میں جب لوگوں کا مقدمہ پیش ہوگا تو سارے علم کے باوجود اللہ مزید تائید کے طور پر ان لوگوں کو کھڑا کرے گا جو قوموں کے ہم عصر تھے۔ انہوں نے ان کے سامنے حق کا پیغام پیش کیا۔ پھر کسی نے مانا اور کسی نے نہیں مانا۔ کسی نے حق کا ساتھ دیا اور کوئی حق کا مخالف بن کر کھڑا ہو گیا۔ یہی تجربہ جو ان صالحین پر براہ راست گزرا اس کو وہ خدا کے سامنے پیش کریں گے۔ یہ ایسا ہی ہوگا جیسے کہ کوئی گواہ عدالت میں اپنے مشاہدے کی بنیاد پر ایک سچا بیان دے۔ اس کے سوا کسی کو قیامت میں یہ اختیار

حاصل نہ ہوگا کہ وہ کسی مجرم کا شافع بن کر کھڑا ہو اور اس کے بارے میں اس خدائی فیصلہ کو بدل دے جو از روئے واقعہ اس کے بارے میں ہونے والا تھا۔ خدا اس سے بہت بلند ہے کہ اس کے حضور کوئی شخص ایسا کرنے کی کوشش کرے۔ دعوت حق کا کام سر اسر نصیحت کا کام ہے۔ آخری مرحلہ میں جب کہ داعی پر یہ واضح ہو جائے کہ لوگ کسی طرح ماننے والے نہیں ہیں اس وقت بھی داعی لوگوں کے لیے خدا سے دعا کرتا ہے۔ لوگوں کی ایذارسانی پر صبر کرتے ہوئے وہ لوگوں کا خیر خواہ بنا رہتا ہے'' ۔[۴۸]

تفسیر تذ کیر القرآن میں دعوت واصلاح کا پہلو ہی نمایاں ہے، قرآن حکیم میں دعوت انبیاء کرام علیہم السلام، آیات انفس وآفاق، قدرت کے مشاہدات اور فطرت انسانی کی جن حقائق کی نشاندہی کی گئی ہے، مولانا وحید الدین خان اُن آیات کریمہ کی تفسیر میں اس اسلوب میں کی ہے کہ جو بھی انسان قرآن کریم کا مطالعہ کرے تو اُسے اس سے مکمل ہدایت وراہنمائی نصیب ہو۔

نتائج

۱۔ مولانا وحید الدین خان کی تفسیر تذ کیر القرآن میں دعوت، اصلاح، تذ کیر، نصیحت کے ساتھ ساتھ داعیاں دعوت اور مخاطب کے احوال ونفسیات کے پہلو سے بہت نمایاں ہے۔

۲۔ دعوت انبیاء علیہم السلام کی طریقہ ہے اور اسی دعوت کو سمجھنے وعام کرنے کی ضرورت ہے جس کے نتیجہ میں تمام انسانوں کو اسلام کے قریب لایا جاسکتا ہے۔

۳۔ مولانا کے نزدیک دعوت وارشاد کا کام نہایت صبر آزما ہے اس لیے وہ داعی کو ان خصوصیات وصفات کا حامل دیکھنا چاہتے ہیں جو قرآن کریم نے دعوت انبیاء علیہم السلام کے ضمن میں بیان کی ہے۔

۴۔ داعی مدعو کی صلاحیت کے مطابق کلام کرے نیز اس کی عملی زندگی دعوتی زندگی کا نمونہ ہو۔

۵۔ دعوت کا کام صرف داعی کی کاوش پر منحصر نہیں ہوتا بلکہ مدعو کی توجہ جب تک نہ ہو دعوت کا فریضہ کامل طور پر ادا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے مدعو کو بھی چاہیے کہ وہ توجہ کے ساتھ داعی کا کلام سنے۔

۶۔ قرآنی اصول دعوت کی پیروی میں ہی دعوت بہ طریقِ احسن پہنچائی جاسکتی ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ ماہنامہ تذ کیر (مرتب احسن تہامی)، دار التذ کیر، غزنی سٹریٹ لاہو شمارہ ۲، فروری ۲۰۰۶ء، ج ۱۹، ص ۳۔۲

۲۔ سورة الغاشية ۸۸: ۱۷

۳۔ ماہنامہ تذ کیر، ج ۱۹، ص ۳۔۲، شمارہ ۲، فروری ۲۰۰۶ء

۴۔ ماہنامہ تذ کیر، ج ۱۹، ص ۳۔۲، شمارہ ۲، فروری ۲۰۰۶ء

۵۔ ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی، مولانا وحید الدین خان علماء اور دانشوروں کی نظر میں، قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۰۵

۶۔ ماہنامہ تذکیر، ج۱۹، ص۳-۲، شمارہ ۲، فروری ۲۰۰۶ء
۷۔ ماہنامہ تذکیر، ج۱۹، ص۳-۲، شمارہ ۲، فروری ۲۰۰۶ء
۸۔ وحیدالدین خان، مولانا، مولانا، مذہب اور سائنس، مکتبہ الرسالہ نئی دہلی، ص ۲۳
۹۔ وحیدالدین خان، مولانا، تعبیر کی غلطی، مکتبہ الرسالہ نئی دہلی، ص۱۵
۱۰۔ ماہنامہ تذکیر، ج۱۹، ص۳-۲، شمارہ ۲، فروری ۲۰۰۶ء
۱۱۔ وحیدالدین، مولانا، دیباچہ تفسیر تذکیر القرآن، دارالتذکیر، لاہور، ۲۰۰۳ء، ج۱، ص۷
۱۲۔ ایضاً، ج۱، ص۸
۱۳۔ سورۃالبقرۃ ۲:۲۶
۱۴۔ تذکیر القرآن، ج۱، ص۲۴
۱۵۔ سورۃ البقرۃ ۲:۱۴۴
۱۶۔ تذکیر القرآن، ج۱، ص۶۰
۱۷۔ سورۃالبقرۃ ۲:۱۵۵
۱۸۔ تذکیر القرآن، ج۱، ص۶۰
۱۹۔ سورۃالبقرۃ ۲:۱۴
۲۰۔ تذکیر القرآن، ج۱، ص۶۰
۲۱۔ سورۃ آل عمران ۳:۱۹
۲۲۔ تذکیر القرآن، ج۱، ص۶۰
۲۳۔ سورۃ آل عمران ۳:۱۰۴
۲۴۔ سورۃ العنکبوت ۲۹:۴۶
۲۵۔ تذکیر القرآن، ج۱، ص۶۰
۲۶۔ سورۃ آل عمران ۳:۱۱۰
۲۷۔ سورۃ النساء ۴:۸۱
۲۸۔ تذکیر القرآن، ج۱، ص۶۰
۲۹۔ سورۃ النساء ۴:۱۱۴
۳۰۔ تذکیر القرآن، ج۱، ص۶۰
۳۱۔ سورۃ المائدۃ ۵:۶۷
۳۲۔ تذکیر القرآن، ج۱، ص۲۷۵
۳۳۔ سورۃ المائدۃ ۵:۶۷
۳۴۔ تذکیر القرآن، ج۱، ص۳۲۵

۳۵ ۔ سورۃ الاعراف ۷:۱۹۹
۳۶ ۔ تذکیر القرآن، ج۱، ص۴۲۹
۳۷ ۔ سورۃ یونس ۱۰:۱۰۸
۳۸ ۔ تذکیر القرآن، ج۱، ص۵۶۳
۳۹ ۔ سورۃ النحل ۱۶:۱۲۵
۴۰ ۔ تذکیر القرآن، ج۱، ص۷۵۷
۴۱ ۔ ایضاً، ج۱، ص۷۵۷
۴۲ ۔ سورۃ طٰہ ۳۰:۳
۴۳ ۔ تذکیر القرآن، ج۲، ص۶۴
۴۴ ۔ سورۃ طٰہ ۳۰:۲۵
۴۵ ۔ سورۃ طٰہ ۳۰:۲۵
۴۶ ۔ سورۃ مؤمنون ۲۳:۹۶
۴۷ ۔ سورۃ الزخرف ۴۳:۸۶
۴۸ ۔ تذکیر القرآن، ج۲، ص۵۵۵